اسرار خودی کا مرکزی موضوع

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی

مثنوی اسرارِ خودی سے قبل اقبال نے جو نظمیں اور غزلیں کہیں وہ بانگ درا میں شامل ہیں۔ قیام یورپ کے زمانے میں جب انہوں نے فلسفۂ عجم پر اپنا علمی مقالہ لکھا اور اس ضمن میں فارسی ادب اور تصوف کا گہرا مطالعہ کیا تو انھوں نے محسوس کیا کہ دنیا میں مسلمانوں کی کمزوری اور انحطاط کا ایک بڑا سبب عجمی تصوف اور نفی خودی کا وہ تصور ہے جو انسانی وجود کو موہوم سمجھتا ہے، یاس وقنوطیت کی تعلیم دیتا ہے اور سعی وعمل کی بجائے یہ سکھاتا ہے کہ دوڑنے سے لے کر چلنے، کھڑا رہنے، بیٹھنے، سونے اور مرنے تک سکون کی ہر منزل میں زیادہ راحت ہوتی ہے:

بقدر ہر سکوں راحت بود، بنگر تفاوت را
دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن

اقبال کو یقین تھا کہ اس شدید کش مکش حیات کے زمانے میں اگر اسی تصور حیات کو لیے رہیں اور اپنی انفرادی اور اجتماعی قدر و قیمت نہ جانیں تو ان کا جو حشر ہونے والا ہے اس کی پیش قیاسی، بلقان اور طرابلس کی جنگوں سے ہو سکتی ہے۔

اس احساس کے تحت قیام یورپ کے زمانے میں انھوں نے اپنا آئندہ پروگرام یہ بنایا کہ اہل مشرق خصوصاً مسلمانوں کو ان کا اپنا جلوہ دکھا کر ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کی ترغیب دی جائے تاکہ وہ اپنا حقیقی مقام حاصل کر لیں۔ اس پروگرام کا اشارہ انھوں نے اپنی اس نظم میں بھی کیا ہے جو سر شیخ عبدالقادر کے نام لکھی گئی تھی۔ ہندوستان واپس پہنچنے کے بعد بھی وہ اس پروگرام کو عمل میں لانے کی فکر کرتے رہے اور وقت بوقت اپنی اردو نظموں میں ملت کو اس حقیقت سے آگاہ کرتے رہے۔ اس کی ایک بہترین مثال ان کی نظم شمع وشاعر میں ملتی ہے جو ۱۹۱۲ء میں لکھی گئی تھی اور جس میں پورے دو بند اسی موضوع کے لیے وقف ہیں اس کے صرف چند شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں:

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
شعلہ بن کے پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گر باطل بھی تو
بے خبر تو جوہر آئینہ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے
اپنی اصلیت سے ہو آگاہ، اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتار طلسم ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

پھر انھیں خیال ہوا کہ یہ جستہ جستہ اشعار یا نظمیں اس مقصد کے لیے کافی نہیں ہیں، بلکہ ایک پوری کتاب لکھنی چاہیے جس میں فلسفۂ خودی اور تصور حیات کی تشریح دلآویز پیرائے میں ہو سکے جو مسلمانانِ عالم کے لیے ایک مکمل لائحۂ عمل کا کام دے۔ اس کے لیے انھیں ناگزیر طور پر اردو کو چھوڑ کر فارسی کی طرف رجوع کرنا پڑا کیونکہ اول تو صدیوں اور مدتوں سے فارسی زبان سمجھتے سمجھتے مشکل سے مشکل اور خشک سے خشک فلسفیانہ مطالب کے ادا کرنے پر قادر ہو گئی تھی اور دوسرے یہ کہ اقبال نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں تک یہ پیغام پہنچانا چاہتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لیے اردو کی بہ نسبت فارسی زبان زیادہ موزوں تھی۔

عجمی تصوف کے مطالعے کے دوران میں اقبال نے مثنوی مولانا روم کا بھی نہایت غور کے ساتھ مطالعہ کیا تھا اور مولانا کا اثر ان پر اس قدر گہرا ہوا تھا کہ وہ اس معاملے میں انھیں اپنا مرشد اور رہبر سمجھنے لگے اور اپنی تصنیف کی بنیاد بھی مثنوی معنوی کے وزن میں اور بحر میں ڈالی۔ چنانچہ مثنوی اسرارِ خودی بھی اسی بحر رمل یعنی ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن'' میں ہے اور اس میں وہی تمثیلی اور حکایتی طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو مثنوی معنوی کا طرہ امتیاز ہے۔ حقیقت ہے یہ ہے کہ اس قسم کی مثنوی سب سے پہلے حکیم

سنائی غزنوی لکھی تھی جس کی وفات ۵۴۶ھ ہوئی اور جس کی تصنیف حدیقة الحقیقة حدیقہ سنائی کے نام سے مشہور ہے پھر اس قسم کی مثنویاں شیخ فریدالدین عطار (منطق الطیر) ملا جامی (یوسف زلیخا) شیخ سعدی (بوستان) اور مولانا روم وغیرہم نے تحریر کیں۔

مولانا روم نے ساتویں صدی ہجری کے وسط میں اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مسلمانوں نے خود پرستی اور عشرت پسندی کے باعث اپنی تباہی مول لی اور تاتاریوں کے ہاتھوں ذلیل وخوار ہوئے۔ انھوں نے کہا مسلمان دنیا کو اس طرح کھو بیٹھے اور اگر انانیت اور کبر میں مبتلا رہے تو اندیشہ ہے کہ دین بھی کھو بیٹھیں گے۔ اقبال بھی اس چودھویں صدی ہجری میں مسلمانوں کی سلطنت کا شیرازہ بکھرتا ہوا دیکھتے ہیں لیکن اس مرض کی تشخیص بالکل مختلف کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان راہ عمل پر گامزن نہیں ہیں اور جدید سائنسی تمدن کی ظاہری چمک دمک سے مرعوب ہو کر احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ وہ جوہر خودی سے بے خبر اور انسان کی حقیقی عظمت سے ناواقف ہیں۔ چنانچہ اقبال اپنی تصنیف کی ابتداء میں مولانا روم کی مشہور غزل کے تین شعر درج کر کے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ جو ہر طرف ایک ہجوم اور انبوہ کثیر نظر آتا ہے ان میں انسان نما حیوان تو بہت ہیں لیکن انسان شاذ و نادر ہی پائے جاتے ہیں۔

مثنوی اسرار خودی اصل میں تفسیر اور تشریح ہے اس مشہور روایت کی کہ ''من عرفه نفسه فقد عرف ربه''جس کا خلاصہ اس شعر میں درج ہے کہ:

غلام ہمت آں خود پرستم
کہ با نور خودی بیند خدا را

اس تفسیر و تشریح کے لیے اقبال ایک طرح کا مستقل منطقی استدلال تیار کرتے ہیں تاکہ انسان اپنی حقیقت کو پہچان کر اور اپنی شخصیت کی تربیت کر کے معرفت رب حاصل کرے اور نیابت الٰہی کی منزل پر پہنچ جائے۔ نظام عالم کی بنیاد خودی پر ہے اور جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ صرف خودی کا کھیل ہے انفرادی زندگی کا تسلسل خودی کو مستحکم کرنے پر ہوتا ہے اور زندگی کا باقی رہنا تخلیق اور تولید مقاصد کی بنا پر ہے زندگی نام ہے تلاش و جستجو کا۔ عشق الٰہی اور محبت رسولؐ سے خودی مضبوط اور مستحکم ہوتی ہے اور اغیار سے سوال کرنے، یا ان کے دستِ نگر اور محتاج ہونے سے خودی کمزور اور ضعیف ہو جاتی ہے اس لیے خود دار انسان کو کسی کا احسان نہیں اٹھانا چاہیے۔ جب عشق و محبت سے خودی مستحکم ہو جاتی ہے تو پھر انسان کائنات کی ظاہری اور مخفی قوتوں کو مستحکم کرتا ہے اور ان سے اپنی خدمت لے سکتا ہے:

پیکر ہستی ز آثار خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است

چوں حیات عالم از زور خودی است
پس بہ قدر استواری زندگی است
زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است
ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم
از شعاع آرزو تابندہ ایم

پھر اقبال بتاتے ہیں کہ نفی خودی کا اصول مغلوب اور مفتوح قوموں کا ایجاد کیا ہوا ہے۔ یہ مفتوح قومیں چاہتی ہیں کہ غالب اور فاتح قوموں کو بھی کمزور کر دیں تا کہ ان کے ظلم وستم سے نجات پائیں، اس لیے وہ بے خودی اور فنائیت کے مسلک کا پرچار کرتی ہیں۔ اس کی مثال دیتے ہوئے اقبال بکریوں کے ایک گروہ کا قصہ بیان کرتے ہیں جو شیروں کے ظلم سے تنگ آ کر تلقین کرنے لگا تھا کہ گوشت کھانا حرام ہے۔ اقبال فنائیت کی اس تلقین کو مسلک گوسفندی کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ یہ مسلک افلاطون کا پیش کیا ہوا ہے چونکہ افلاطون کا اثر مسلمان صوفیوں اور مفکرین پر کافی زیادہ تھا۔ اس لیے مسلمان بھی اس مسلک گوسفندی کے پیرو ہو گئے اور اپنی کمزوری اور انحطاط کی تہذیب کی علامت سمجھنے لگے۔

اقبال مسلمانوں کو افلاطون کے مسلک گوسفندی سے احتراز کی تاکید کرتے ہیں پھر وہ شعر کی حقیقت بیان کر کے اسلامی ادبیات کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں تا کہ ادب اور فن کو عجمیت اور بے عملی سے خودی اور زندگی کی طرف واپس لایا جائے۔ اس کے بعد وہ تشریح کرتے ہیں کہ خودی کی تربیت کس طرح ہو سکتی ہے اس کے لیے انھوں نے تین مرحلے متعین کیے ہیں۔

پہلا مرحلہ اطاعت کا ہے کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اعلیٰ اور حقیقی حریت اطاعت یعنی پابندی فرائض سے ہی حاصل ہوتی ہے اسی لیے وہ مسلمانوں کو تاکید کرتے ہیں کہ چونکہ جبر ہی سے اختیار حاصل ہوتا ہے اس لیے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اطاعت بجالائیں اور فرائض کی سختی کی شکایت نہ کریں جو شخص چاند اور ستاروں کو مسخر کرنا چاہتا ہے اس کے لیے قوانین وفرائض کی پابندی لازمی ہے:

در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار
شکوہ سنج سختی آئیں مشو
از حدود مصطفیٰ بیروں مشو

ہر کہ تسخیر مہ و پرویں کند
خویش را زنجیری آئیں کند

تربیت خودی کے لیے دوسرا مرحلہ ''ضبط نفس'' کا ہے یعنی اپنے نفس پر قابو حاصل کرنے کا کیونکہ جس شخص کا حکم اپنی ذات پر نہیں چلتا وہ لازماً، دوسروں کا محکوم ہو جاتا ہے:

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں
می شود فرماں پذیر از دیگراں

جب اس طرح تربیت کے بعد خودی کی تکمیل ہو جاتی ہے تو وہ اپنی تیسری منزل میں پہنچ جاتی ہے یعنی نیابت الٰہی کی حقدار بن جاتی ہے۔ ایسا شخص نوع انسان کی کھیتی کا ماحصل اور کاروان زندگی کی منزل ہوتا ہے کہ جس پر انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے:

نائب حق در جہاں آدم شود
بر عناصر حکم او محکم شود
نائب حق ہمچو جان عالم است
ہستیِ او ظل اسم اعظم است

یعنی جب انسان اس دنیا میں نیابت الٰہی کے درجے پر پہنچ جاتا ہے تو عناصر پر اس کی حکمرانی ہوتی ہے وہ کائنات کی روح ہوتا ہے اور اس کی ہستی اسم اعظم کی طرح مشکل کشائی کرتی ہے اس کی قوت و جبروت میں دنیا کی نجات مضمر ہے۔

حضرت سید مخدوم علی ہجویریؒ کی زبانی اقبال اہل ملت کو نصیحت کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو کمزور و ناتواں نہ سمجھیں بلکہ قوی سے قوی دشمن کے مقابلے کے لیے تیار ہو جائیں۔ جب پتھر خود کو شیشے کی مانند کمزور سمجھنے لگتا ہے تو واقعی شیشہ بن کر ٹوٹنے لگتا ہے۔ تم اپنے آپ کو محض پانی اور مٹی کب تک سمجھتے رہو گے۔ اپنی خاک سے شعلہ طور پیدا کرو۔ حیوان کی طرح کھانا اور سونا زندگی مقصد نہیں ہے۔ جب انسان اپنے آپ کو خودی کی بناء پر مضبوط کر لیتا ہے اور سخت محنت و مشقت کرتا ہے تو اس سے دونوں جہان روشن ہو جاتے ہیں اور وہ کائنات کی قوتوں کو مسخر کرتا ہے۔ زندگی کی آبرو سختی اور طاقت میں مضمر ہے ناتواں اور کمزور ہونا بے چارگی اور ناتجربہ کاری پر دلالت کرتا ہے۔

اے ز آداب امانت بے خبر
از دو عالم خویش را بہتر شمر

سنگ چون بر خود گمان شیشه کرد
شیشه گردید و شکستن پیشه کرد
تا کجا خود را شماری ماء و طین
از گل خود شعلهٔ طور آفرین
مثل حیواں خوردن آسودن چه سود
گر بخود محکم ندانی، بودن چه سود
خویش را چوں از خودی محکم کنی
تو اگر خواہی جہاں برہم کنی
می شود از وے دو عالم مستنیر؟
ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر
در صلابت آبروئے زندگی است
ناتوانی، ناکسی، ناپختگی است

ہر فرد کی زندگی میں سب سے زیادہ اہم سوال مقصد حیات کے متعلق ہوتا ہے کہ وہ کس کے لیے وجود میں آیا ہے۔ اقبال جواب دیتے ہیں کہ ایک مسلم کی زندگی کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا اسی کے ساتھ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ایسا جہاد جس کا محرک صرف زمین فتح کرنا ہو وہ مذہب اسلام میں حرام ہے۔ کیونکہ اگر مسلمان کی تلوار سے حق کی آواز بلند نہ ہو تو ایسی جنگ قوم کے لیے نامبارک ہوتی ہے۔

گر نہ حق گردد ز تیغ ما بلند
جنگ باشد قوم را ناارجمند

اس ضمن میں وہ حضرت شیخ میاں میرؒ کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ جب بادشاہ ہند نے محض حرص و ہوس کی خاطر دکن کی تسخیر کا ارادہ کیا تو شیخ نے اس کو بہت کچھ لعنت ملامت کی اور کہا کہ ایک بادشاہ کی بھوک تمام ملک وملت کے لیے فنا کا پیغام لاتی ہے جو کوئی سوائے اللہ کے کسی اور کے لیے خنجر کھینچتا ہے تو اس کا خنجر اسی کے سینے میں اترتا ہے اور اس سے خود اسی کو نقصان پہنچتا ہے:

آتش جان گدا جوع گداست
جوع سلطان ملک و ملت را فناست
ہر کہ خنجر بہر غیر اللہ کشید
تیغ او در سینہ او آرمید

پھر اقبال عقل اور عشق کا موازنہ کرتے ہیں جو ان کے تصور حیات کا ایک امتیازی مسئلہ ہے اور جس کو انھوں نے اپنے کلام میں بار بار پیش کیا ہے۔ یہاں اس قدر واضح کر دینا ضروری ہے کہ اقبال علم اور عقل کے مخالف نہیں تھے لیکن ان کو بے لگام چھوڑ نا نہیں چاہتے تھے بلکہ ایمان اور عشق کے تابع رکھنا چاہتے تھے۔ ان کی رائے میں عصر حاضر اور تہذیب جدید کی تباہ کاری بڑی حد تک اسی وجہ سے ہے کہ انسان علم اور عقل کی محدود درسائی سے واقف نہیں ہیں اور ان کے غلام بن گئے ہیں۔ اقبال بتاتے ہیں کہ مسلمان کا علم سوز دل کی بناء پر کامل ہوتا ہے۔ عقل کی خامیوں اور خرابیوں کا علاج عشق سے کیا جا سکتا ہے اور اس کی وجہ سے جو فتور دماغ میں پیدا ہوتا ہے وہ عشق کے نشتر ہی سے دور ہوتا ہے:

علم مسلم کامل از سوزِ دل است
معنی اسلام ترک آفل است
عشق افلاطون علت ہائے عقل
بہ شود از نشترش سودائے عقل

ہندوستان کے مسلمانوں کو، جو اپنی خودی اور شخصیت کھو بیٹھے ہیں اور غیروں کی اداؤں کے دل دادہ ہیں اقبال میر نجات نقشبند ؒ کی زبانی نصیحت کرتے ہیں کہ امت مسلمہ کی محفل کو غیروں کے چراغ سے آگ لگ گئی ہے اور ان کی مسجد کو بت خانے کی چنگاری نے جلا دیا ہے۔ اے مسلم! تو جو غیروں کے دسترخوان سے ٹکڑوں کی بھیک مانگ رہا ہے گویا اپنی دولت دوسرے کے ہاں تلاش کر رہا ہے۔

تیسری مثال گلاب کے اُن پتوں کی طرح ہے جو اپنی بولٹا کر پژمردہ اور پریشان ہو چکے ہیں:

بزم مسلم از چراغ غیر سوخت
مسجد او از شرارِ دیر سوخت
اے گدائے ریزۂ از خوانِ غیر
جنس خود می جوئی از دکان غیر
شد پریشاں برگ گل چوں بوئے خویش
اے ز خود رم کردہ باز آ سوئے خویش

اقبال نے حضرت امام شافعی ؒ کے مشہور مقولے ''الوقت سیف قاطع'' کی تفسیر کی ہے کہ زمانہ ایسی شمشیر براں ہے کہ یہ جس کے ہاتھ ہو اس کی قدرت حضرت موسیٰ ؑ کی قدرت سے زیادہ ہوتی ہے۔ حیدر کرارؓ کے ہاتھ میں شمشیر روزگار تھی جس سے آپ نے درہ خیبر کو فتح کیا جو شخص زمانے کو محض دن اور رات کی تعداد سے ناپتا ہے وہ گمراہی میں ہے اور زمانے کی اصل حقیقت سے ناواقف ہے اور جو شخص زمانے کی

اصل حقیقت سے واقف نہیں وہ حیات جاوداں سے بھی آگاہ نہیں ہے۔ زمان کو لیل و نہار کے پیمانے سے اس طرح ناپنا جیسے کہ فضا کو طول و عرض کے ذریعے ناپا جاتا ہے، بڑی سخت غلطی ہے۔ انسانی زندگی کا المیہ یہ ہے کہ زمان کی اصل حقیقت کو سمجھ کر زندگی کو فروغ دینے کی بجائے انسان زمان کو مکان کی طرح پیمائش کر کے گردش لیل و نہار میں اسیر ہو جاتا ہے:

اے اسیر دوش و فردا در نگر
در دل خود عالمے دیگر نگر
باز با پیمانۂ لیل و نہار
فکر تو پیمود طول روزگار
تو کہ از اصل زماں آگہ نہ ای
از حیات جاوداں آگہ نہ ای
تا کجا در روز و شب باشی اسیر
رمز وقت از ''لی مع اللّٰہ'' بازگیر
اصل وقت از گردش خورشید نیست
وقت جاوید است و خور جاوید نیست
زندگی از دہر و دہر از زندگی است
''لا تسبوا الدھر'' فرمان نبیؐ است

پھر اقبال مردِ آزاد اور بندۂ محکوم کا فرق بیان کرتے ہیں کہ محکوم زمانے کی قید و بند میں جکڑا ہوا ہوتا ہے اور اس سے باہر نہیں نکل سکتا لیکن مردِ آزاد زمانے پر قابو پاتا ہے اور اس سے اپنے مطلب و منشا کے موافق کام لیتا ہے۔ محکوم کی فطرت ہی تقلید اور تحصیل حاصل کی طرف مائل ہوتی ہے اور کوئی نادر کام اس کے ہاتھ سے انجام نہیں پاتا۔ لیکن مردِ آزاد ہر دم نئی تخلیق کرتا رہتا ہے اور اس کے ساز سے ہمیشہ تازہ نغمے نکلتے ہیں۔ اس کی فطرت تکرار کو پسند نہیں کرتی اور نہ وہ کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی حلقے میں چکر لگاتا ہے۔ انتہا یہ کہ مردِ آزاد کی اہمت قضا و قدر کی مشیر ہوتی ہے اور ماضی اور مستقبل اس کے حال میں ضم ہو جاتے ہیں:

عبد گردد بادہ در لیل و نہار
در دل حر بادہ گردد روزگار
عبد از ایام می بافد کفن
روز و شب را می تند بر خویشتن

عبد را ایام زنجیر است و بس
بر لب او حرف تقدیر است و بس
ہمت حر با قضا گردد مشیر
حادثات از دست او صورت پذیر
رفتہ و آئندہ در موجود او
دیرہا آسودہ اندر زودِ او

آخر میں اقبال مسلمانوں کو اس زمانے کی یاد دلاتے ہیں جب کہ ان کے دم سے اس دنیا میں رونق تھی جب کہ کائنات کی قوتیں ان کے توانا اور قوی ہاتھوں میں مسخر تھیں، جب کہ انھوں نے دلوں کی کھیتی میں مذہب کا بیج بو دیا تھا اور حق و صداقت کو بے نقاب کیا تھا، جب ان کا ناخن سازِ ہستی کے لیے مضراب تھا اور کائنات کے اسرار کی عقدہ کشائی کرتا تھا، جب اس زمین کی قسمت ان کے سامنے سجدہ کرنے سے جاگ اٹھی تھی، جب ان کے دم سے دنیا میں تکبیر کا نعرہ بلند ہوا تھا اور ان کی خاک سے کعبے کی تعمیر ہوئی تھی:

جام ما ہم زیب محفل بودہ است
سینۂ ما صاحب دل بودہ است
عصر نو از جلوہ ہا آراستہ
از غبار پائے ما برخواستہ
ناخن ما عقدۂ دنیا کشاد
بخت ایں خاک از سجود ما کشاد
عالم از ما صاحب تکبیر شد
از گل ما کعبہ ہا تعمیر شد

اس لیے وہ واضح طور پر اعلان کرتے ہیں کہ اگرچہ تخت و تاج آج مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئے ہیں اور اغیار کی نگاہوں میں وہ زیان کار اور ذلیل و خوار ہیں لیکن وہ اب بھی توحید کے علمبردار اور دین سرورِ کونینؐ کے محافظ ہیں۔ خدائے بزرگ و برتر کی نظروں میں وہ سرمکنون ہیں اور دنیا کی خلافت انہی کے لیے ہے۔ چاند اور سورج ان ہی کے نور سے روشن ہیں کیونکہ ان کی ذات حق کا مظہر ہے۔ ان کی ہستی خدا کی نشانی ہونے کے باعث کبھی فنا پذیر نہیں ہوسکتی:

اعتبار از لا الہ داریم ما
ہر دو عالم را نگہ داریم ما

مہر و مہ روشن ز تاب ما ہنوز
برق ہا اندر سحاب ما ہنوز
ذات ما آئینہ ذات حق است
ہستی مسلم ز آیات حق است

غرض یہ ابتدا تھی اقبال کی تعلیم خودی کی جس کو ایک چوتھائی صدی تک وہ بار بار دہراتے رہے اور جو ان کے پیام کا اہم ترین جزو ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی پستی اور ذلت کا بڑا سبب یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھول گئے ہیں اور اپنی پوشیدہ قوتوں سے واقف نہیں ہیں۔ اس پر وہ اس شد و مد کے ساتھ یقین رکھتے ہیں کہ منکر خودی کو منکر خدا سے بڑھ کر کافر سمجھتے ہیں:

منکر حق نزد ملا کافر است
منکر خود نزد من کافر تر است

اس طرح اقبال نے مسلمانوں کے دل و دماغ سے احساس کمتری کو دور کرنے کی کوشش کی اور یہی مثنوی اسرار خودی کا مرکزی موضوع ہے۔